

لکھنوی تہذیب و ثقافت کا عمومی جائزہ

A general overview of Lucknow civilization and culture

عثمانیہ سلطانہ

پی ایچ ڈی سکالر، لاہور گریجویٹ یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر محمد ارشد اویسی

صدر شعبہ اردو، لاہور گریجویٹ یونیورسٹی، لاہور

Abstract:

Ajodhya, an old city of Hindustan, is known as "Awaddh". Which first capital (in Nawaban-e-Awaddh age) was Faiazbad and then after Nawab Asifuddaulah's arrival in Likhnow remained its capital. Nwab-an-e-Awaddh were Ahl-e-Tashyuh. Nawaban-e-Awaddh (Nwab Asifuddoulah and after that till last Nawab Wajid Ali Shah) were fond of Literature so they obliged Literary persons, like, Mushafi, Jura, at, Rangeen, Meer, Sauda, Insha, Nasikh Aatish etc. These poets set the foundation of a new Urdu school of thought which is called "Dabistan-e-Likhnow". This school of thought is different from "Dabistan-e-Delhi" in different literary qualities. "Dabistan-e-Likhnow" has some values and qualities in its literature which are narrated in below lines.

Keywords:

India, Ayodhya, Lucknow Civilization, Sanskrit, Bin Bas, Kingdom of Kosala, Lakshman, Lakshmavati, Lakshampur, Lakhanpur, Lakhan Qila, Lakhan Ahir, Lakhan Pasi, Lakshmi, Lakshmanavati, Lakshmanavat

ہندوستان کا قدیم مذہبی شہر اجدوہیا جس کی دیرینہ تاریخ رامائن میں موجود ہے، اودھ کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ سنسکرت زبان یہ لفظ "وعدے یا بیان" کے معنی میں آتا ہے جو دراصل رام چندر جی کے ابقائے عہد کی جانب ایک اشارہ ہے۔ ان کے بن باس کے بعد اجدوہیا عام طور پر اودھ کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ بعد ازاں پورا صوبہ ہی اودھ کے نام سے موسوم ہو گیا جس کا مرکز اجدوہیا تھا۔ اسلامی عہد سے اودھ وہ صوبہ ہے جو دریائے گنگا کے سرسبز و زرخیز میدان کا ایک وسطی حصہ ہے جس کا رقبہ تقریباً تیس ہزار نو سو تیس (۲۳۹۳۰۳) مربع میل ہے۔

زمانہ قدیم میں لکھنؤ "مملکت کو سل" کا حصہ تھا۔ قدیم ہندو وایتوں کے مطابق رام نے اپنی وراثت کو اپنے بھائی لکشمن کے سپرد کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے "لکشماوتی"، "لکشتم پور" یا "لکھن پور" جیسے ناموں سے جانا اور پہچانا گیا جو بعد ازاں بدل کر "لکھنؤ" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہاں سے ایودھیا کی مسافت ۸۰ میل ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق اس شہر کا نام "لکھن قلعہ" کے اہم فنکار "لکھن اھیر" کے نام پر رکھا گیا۔ مگر دولت اسے علاقے کے دولت حکم ران "لکھن پاسی" کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ اس علاقے کو "لکھن پور" کہا جاتا تھا جو گیارہویں صدی میں "لکھنؤ" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ ایک اور مفروضہ بھی موجود ہے جس کے مطابق شہر کا نام دولت کی ہندو دیوی لکشمی کے نام پر "لکشماوتی" سے "لکشمنات" اور آخر کار "لکھنؤ" ہو گیا۔

۱۳۵۰ء کے بعد سے سلطنت دہلی، سلطنت جونپور، مغلیہ سلطنت اور نواب اودھ، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی راج کے دوران لکھنؤ ریاست اودھ میں شامل رہا ہے۔ جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء کے دوران لکھنؤ کا شمار بڑے مراکز میں ہوتا تھا۔ ۱۹ء تک اودھ مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ رہا۔ اس کا گورنر برہان الملک سعادت علی خان تھا جس نے لکھنؤ کے قریب فیض آباد کو اپنا مرکز بنایا۔ (۱۳۹۴ء سے ۱۴۷۸ء تک) اودھ، تقریباً چوراسی سال سلطنت جونپور کا حصہ رہا۔ ۱۵۵۵ء کے لگ

بھگ مغل شہنشاہ ہمایوں نے اسے مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا۔ شہنشاہ جہانگیر نے اسے اپنے ایک پسندیدہ شاہی افسر شیخ عبدالرحیم کو جاگیر کے طور پر عطا کیا جو بعد ازاں اس کی اولاد کے قبضے میں رہی۔

فیض آباد اور لکھنؤ میں مسلمانوں کے تباہ حال گھرانوں کے ساتھ ساتھ دلی کے مجلسی آداب اور تہذیبی اطوار کے لیے بھی ایک جائے پناہ کا کام دینے لگا تھا۔ اس تہذیبی احیاء میں تین بڑے عناصر نے لکھنؤ کی تہذیب کو ایک امتیازی حیثیت عطا کی تھی۔ ان میں سب سے اہم عنصر یہاں کی خوشحالی، دوسرے مذہب کا ایک خاص انداز اور تیسرے اودھ کی مقامی خصوصیات شامل ہیں۔

ایرانی نوواردوں میں سید امین نیشاپوری ۱۱۳۰ھ مطابق ۱۷۰۷ء میں ہندوستان آئے۔ یہ پہلے سر بلند خان کے میر منزل ہو گئے اور بعد میں قطب الملک کے توسط سے شہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکہ ملا۔ پھر سعادت خاں کے خطاب اور ہنڈون اور بیانہ کی فوجداری سے نوازے گئے۔ بعد ازاں ۱۷۲۰ء میں اپنے مرئی قطب الملک کے خلاف تحریک سازش میں شریک ہو گئے اور بیانہ کے مقام پر قطب الملک کے بھائی امیر الامرا سید حسین علی کو قتل کرادیا۔ بادشاہ نے ایک عارضی دربار منعقد کر کے سادات کے قاتلوں کو انعامات دیے تو سعادت خاں بیچ ہزاری پر منصب فائز ہوئے۔ وزیر السلطنت محمد امین کا انتقال پر انھیں بادشاہ نے آگرہ کا گورنر بنا دیا۔ اس کے کم و بیش دو سال بعد سعادت خاں برہان الملک کو آگرہ کے علاوہ اودھ کی صوبہ داری بھی دے دی گئی لیکن کچھ عرصے بعد وہ صرف اودھ کے صوبہ دار رہ گئے۔

میر محمد امین سعادت خاں برہان الملک اور اس کی سلطنت مغلیہ کے لیے خدمات اور کارناموں کی ایک جھلک درج ذیل اقتباس میں ملتی ہے:

”اودھ کی سلطنت میر محمد امین سعادت خاں برہان الملک نے قائم کی تھی۔ انھوں نے سادات بارہہ کی سرکوبی کے سلسلہ میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں اس لئے بادشاہ دہلی کی طرف سے ۱۷۲۰ء میں انھیں بیچ ہزاری منصب اور اکبر آباد کی صوبہ داری ملی لیکن تھوڑے دنوں بعد ان کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ جہاں اس زمانہ میں شیوخ نے مرکز سے سرکشی اختیار کر کے اپنی متوازی حکومت قائم کر لی تھی۔ برہان الملک نے شیوخ کا زور توڑا اور امن وامان قائم کر لیا اور نواب وزیر کھلانے لگے، ان کا تعلق ایران کے صفوی خاندان سے تھا اس لئے عقائد کے اعتبار سے شیعہ تھے۔

برہان الملک نے اجدوہیا کے قریب، ایک شہر آباد کیا جس کا نام فیض آباد رکھا اور اسی کو پایہ تخت بنایا۔“ (۱)

اس وقت اودھ کا صوبہ پانچ سرکاروں (حویلی اودھ، گور کھپور، بہرائچ اور خیر آباد) پر مشتمل تھا، اس کی آمدنی ستر لاکھ کے قریب تھی جو بعد میں سعادت خاں کے انتظام سے دو کروڑ سالانہ تک پہنچ گئی۔ آصف الدولہ کے عہد میں ریاست اودھ، بریلی، لکھنؤ اور الہ آباد صرف تین صوبوں میں تقسیم رہی۔

ریاست اودھ اور اس کے والیان کے ضمن میں درج ذیل اقتباس قابل غور ہے:

”اودھ کے جس عہد کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں اس میں جو خاندان برسرِ اقتدار تھا اس کے بانی نواب محمد امین سعادت خاں برہان الملک نیشاپوری تھے جو حکومت دہلی کی جانب سے ۱۷۱۹ء میں اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے داماد صفدر جنگ ان کے جانشین ہوئے۔ ۱۷۵۳ء میں صفدر جنگ کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے شجاع الدولہ نے اودھ کی زمامِ اقتدار سنبھالی۔ اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ تھے جنہیں ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے معزول کر کے اس علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ شجاع الدولہ سے واجد علی شاہ تک ایک سو تین سال کے عرصہ پر ہمارا مطالعہ مشتمل ہے۔ اس عرصہ میں اودھ کی ثقافتی زندگی کا محور پہلے تو فیض آباد پھر لکھنؤ بنا۔ شجاع الدولہ نے بکسر کی شکست ۱۷۶۳ء کے بعد اپنے والد کی اتباع میں فیض آباد ہی کو دار الخلافہ قرار دیا اور اس کی تعمیر و ترقی میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو لگایا۔ ان کے انتقال (۱۷۷۵ء) کے بعد ان کے صاحبزادے آصف الدولہ نے بوجہ لکھنؤ کو اپنا دار السلطنت بنایا۔ شجاع الدولہ نے جب زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لی تو اودھ کا علاقہ ۵ سرکاروں پر مشتمل تھا۔ حویلی اودھ، گور کھپور،

بہرائچ، لکھنؤ، خیر آباد۔“ (۲)

لکھنؤی تہذیب و ثقافت، کلچر اور تمدن، لکھنؤ کے محلوں، سڑکوں، گلیوں، منڈیوں، بازاروں، چوکوں، ایشیا کی قیمتوں اور ارزانی، عمارات، باغات، ذرائع نقل و حمل، محلات، محل سراؤں، ڈیوڑھیوں، وضع قطع، رہن سہن، خانگی زندگی، ملازمین و مقربین، دربار، بیرونی معاشرت، دسترخوان، لباس، بعام، ذریعہ معاش، عوام و خواص کے میں بٹیر بازی، کبوتر بازی، مرغ بازی، چنگ بازی، میلے اور دیگر تفریحی اجتماعات، طوائف بازی میں زنانِ خانگی، زنانِ بازاری اور ڈیرے دار طوائفوں، فنونِ لطیفہ میں رقص و موسیقی، مصوری و خطاطی، شنواری و غوطہ خوری، علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں، قدیم عمارتوں، فن کاریوں، صنعت کاریوں، محلات کی زندگی، شادی و غم کی تقاریب اور پست طبقہ کے عوام کے رہن سہن، طرز زندگی اور ان کے مالی حالات پر مشتمل ہے۔

اودھ کی کثیر آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ باقی لوگ مسلمان تھے جن میں اکثریت سنی فرقے کی تھی۔ حکمران خاندان کا مذہب شیعہ ہونے کی وجہ سے دربار اور شہر میں شیعہ رسم و رواج اور شیعہ انداز زندگی کے فروغ پانے کے امکانات روشن ہو گئے تھے۔ سلطنتِ دہلی کی مرکزیت کمزور پڑنے سے پہلے شمالی ہندوستان میں شیعہ شخصی قانون اور شیعہ فقہ کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اس عہد تک شیعہ عقیدہ و رجحان رکھنے والے بھی نماز جمعہ و جماعت، نکاح و طلاق، تجویز و تدفین اور قانون وراثت وغیرہ میں فقہ حنفی کی قانوناً اور رواجاً پیروی کرتے تھے۔ پہلے دو صوبہ داروں یعنی برہان الملک اور صفدر جنگ کے عقیدہ تشیع کے باوجود فقہ جعفریہ کی ترویج اور شیعہ نظام معاشرت و تمدن کی تشکیل نہ ہو پائی تھی۔

لکھنؤ میں ہندی اور اردو دونوں زبانیں بولی جاتی رہیں لیکن اردو کو یہاں صدیوں سے خاص اہمیت حاصل رہی۔ جب دہلی کے حالات بگڑے تو بہت سے شاعروں نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ تب سے اردو شاعری کے دو ٹھکانے ہو گئے، دہلی اور لکھنؤ۔ دہلی صوفی شاعری اور لکھنؤ غزل، عیش و آرام اور عشقیہ شاعری کا مرکز بنا۔ نوابوں کے دورے میں اردو کی خصوصی نشوونما ہوئی اور یہ ایک خاص تہذیب کی نمائندہ زبان کے طور پر ابھری۔ یہاں کے مشہور شاعروں میں حیدر علی آتش، شیخ امام بخش نانا، امیر بینائی، مرزا محمد ہادی رسوا، مصحفی، انشا، صفی لکھنوی، میر تقی میر شامل ہیں۔ لکھنؤ شیعہ ثقافت کے حامل عظیم شہروں میں سے ایک ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کی اردو مرثیہ گوئی مشہور ہے۔

خالص لکھنؤی تہذیب میں بول چال خاص اہمیت کی حامل تھی۔ چنانچہ آداب، تسلیم، تسلیمات، بندگی، کورنش، جراحیسے الفاظ ”عرض ہے“، ”پاجالاتا ہوں“ کے ساتھ مستعمل تھے۔ دیگر الفاظ و تراکیب جیسے زندہ رہو، سلامت رہو، خوش رہو، عمر دراز ہو، صاحبِ اقبال ہو، مزاج شریف، مزاج مبارک، مزاج گرامی، مزاج مقدس، مزاج عالی، اچھا ہوں، الحمد للہ، آپ کی عنایت، خیریت ہے، آپ، تم، جناب عالی، جناب، جناب والا، عالی مرتبت، ولی نعمت، فیض گنجور وغیرہ لکھنؤی تہذیب کے لیے خاص تھے۔ فرنگی محل، خاندانِ اجتہاد، سلطان المدارس، نویستہ، جھوائی ٹولہ، اودھ تیج اور مطیع نول کشور جیسے مراکز علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز تھے۔ ادبی اور ثقافتی اجتماعات میں مشاعرے، صوفیائے کرام کے مزارات اور مجالس مرثیہ خوانی کا ذکر ضروری ہے۔ قدیم عمارتوں کے ضمن میں محرم و چہلم، شاہی اور عوامی تعزیے، محرم اور چہلم کے جلوس، مجالس و خواندگی اور تقسیم تبرک اہمیت کے حامل ہیں۔

سعادت علی خاں کے عہد سے انگریزی کھانے کا رواج بھی ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہشپ، بہیر نے غازی الدین حیدر کی ایک دعوت کا ذکر کیا ہے جس کا انتظام مشرقی انداز پر دسترخوان کے بجائے انگریزی طرز میں انگریزی فرنیچر اور انگریزی اور چینی برتنوں کے ساتھ ساتھ ایشیائے خوردنی میں پلاؤ اور کباب وغیرہ کے علاوہ تہوہ، چائے، مکھن اور انڈا وغیرہ موجود تھے۔

ر نیسوں کے دسترخوان میں صبح سویرے چائے کی پیالی کے ساتھ دو بسکٹ، ناشتا میں ہلکی مقوی غذائیں، پھر دوپہر کا کھانا اور شام کو چائے ہوتی۔ بالائی کی برف اور برف ملائی دوپہر کو لوگ لگاتے تھے۔ چوک بازار میں بیسویں صدی کی ابتدا تک عبداللہ کی دکان کی پوری کچوریاں، سعادت کی شیرمالیں اور گاؤز بانیں، احمد کی باقرخانیاں، شہرانی کے اٹھارہ پرتوں والے پراٹھے، شاہد کا بٹیر پلاؤ، جتن کا مرغ مسلم، ٹنڈے کے کباب، حیدر حسن خاں کے پھانک سے متصل گلی والا انسان کا فر عفرہ، کپتان کے کنویں والی برفیاں اور دیگر بہت سی مرغوب غذائیں ملتی تھیں۔ مرزا محمد عباس علی خاں کے دسترخوان کی ”بڑی روٹی“، قورمہ، قیہ، دوسرے سالن اور ترکاریاں بھی ان دسترخوانوں کی زینت تھیں۔ غذاؤں کی بنیادی اجزاء روٹی، سالن، دال اور چاول تھے۔ عوام میں جاڑے کے موسم میں شب دیگ ایک دو بار سادہ گوشت میں پختی جس میں

عزیز واقارب اور دوستوں کو بلا یا جاتا جب کہ روؤ سا کے ہاں تیتیر، ہیریل، مرغ اور دوسرے پرندوں کے ملے جلے گوشت سے کئی بارشب دیگ تیار ہوتی۔ بادام کی گری، بالائی اور زعفران اس غذا کو معطر بنا دیتے:

”جاڑے کے موسم میں قریب قریب ہر گھر میں دو ایک بار پکتی تھی جن کو مقدرت نہ ہوتی ان کی تواضع ہمسایہ والے کر دیتے تھے۔ روسا و امر کے یہاں موسم سرما میں کئی ایک بارشب دیگ پکوائی جاتی اور عزیزوں نیز دوستوں کی ضیافت ہوتی تھی۔ روسا کے یہاں سادے گوشت کے بجائے تیتیر، ہیریل، مرغ اور دیگر پرندوں کا ملا جلا ہوگا گوشت استعمال ہوتا تھا بادام کی گری، بالائی اور زعفران کی شمولیت اس غذا کو بے حد لذیذ اور بہت معطر بنا دیتی تھی۔ یہ غذایہ، زود ہضم، مصلح معدہ و جگر۔ مولدِ خون صالح اور مقوی اعضائے ربیہ سمجھی جاتی تھی۔“ (۳)

مرزا جعفر حسین کی تالیف ”لکھنؤ کا دسترخوان“ میں بیان کی گئی کھانوں کی طویل فہرست میں سے ”پلاؤ“ کی اقسام کی فہرست اہل لکھنؤ کی نفاست کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

”بابِ نم: پلاؤ: سادہ پلاؤ: چلاؤ، طاہری، مٹر پلاؤ، باقلہ لاؤ، بوٹ پلاؤ۔

گوشت والا: سادہ لاؤ، خاصگی پلاؤ، بجنی پلاؤ، بریانی، سوئیوں کا پلاؤ، بوقلموں پلاؤ، مرغ پلاؤ، انڈہ پلاؤ، مچھلی پلاؤ، پائے پلاؤ، پسندے پلاؤ، مٹر پلاؤ، گوشت والا، مٹر پلاؤ، کباب والا، مٹر پلاؤ گوشت در کباب والا، مٹر پلاؤ گوشت میوہ دار، باقلہ پلاؤ کباب والا، بوٹ پلاؤ کباب والا، پوسٹ پلاؤ، گوشت والا خاصگی۔“ (۴)

پرندوں میں مرغ اور ہیریل، تیتیر، چھوٹی بٹ، چبے اور کملنگ شوق سے کھائے جاتے تھے۔ بٹ، چبے اور کملنگ دریائی پرندوں کی بساند دور کرنے کے لیے مسالوں کے وزن میں لہسن دونا اور وہی ڈبوڑھا کر دیا جاتا تھا۔ ان سب پرندوں کے کباب بننے کے علاوہ کبھی کبھی قورمہ تیار کیا جاتا تھا۔ مرغ اور دوسرے غیر دریائی پرندوں کی کھال اور آلائش دور کرنے کے بعد اندر اور باہر لہسن کے پانی اور پھر بیسن سے دودو باردھو لینا کافی ہوتا تھا۔ کبابوں کے لیے سب پرندوں کے مشترک مسالوں میں پرندوں کے ایک سیر گوشت کے واسطے لہسن کی ایک گٹھی، پیاز دو بڑی گٹھی، ادراک تین تولے، بھنا ہوا دھنیا چار تولے، مرچ سرخ تین تولے، جوز جو تری دوماشے، تیز پات دو عدد، لونگ الائچی چھ عدد، ناریل ڈھائی تولے، خشخاش ڈیڑھ تولے، بھنے چنے چھ تولے، زیرہ سیاہ بھنا ہوا تین ماشے، اور نمک ڈھائی تولے کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہر پرند کے کباب پکانے کے لیے ان مسالوں کو پہلے بہت باریک پیس لینا ضروری تھا۔ ہیریلوں کے کبابوں کے واسطے گھاگر، ہیر فرام، ہوتے تھے۔ چھوٹی یعنی چنک، ہیر نیز چبے صرف قورمہ بنانے کے کام آتے تھے۔

گلوڑی بھی لکھنوی تہذیب کا اہم جزو تھا جس کے اجزائیں کتھہ، چوننا، ڈلی، الائچی اور تمباکو شامل ہیں۔

امر اور روسا کے ساتھ تعلق کے باعث شرفائے لکھنؤ محنت و مشقت کو ننگ و عار کا موجب سمجھتے تھے۔ بعض لوگوں کے ذرائع معاش اور صنعتی فن کاریوں میں چکن و کادمانی و کارچوبی، تانبے، پیتل، لوہے اور مٹی کی برتن سازی کے کام شامل تھے۔ شعر و ادب، طب، وکالت اور ملازمت بھی معاش کے بڑے ذرائع خیال کیے جاتے تھے۔ فن کاریوں اور صنعت کاریوں کے ضمن میں چکن اور کادمانی، کارچوبی، سلمے ستارے کا کام، طلائی اور نقرئی زیورات، پیتل اور تانبے کے ظروف، مٹی کے برتن، کھلونے اور دیگر کئی ایک ایجادات و اختراعات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سیاسی انتشار کے باوجود نوابین اودھ نے اعلیٰ تہذیبی روایات قائم کیں جن کی وجہ سے لکھنؤ آج دنیا میں خوب صورت عمارات، ہندو مسلم یکجہتی اور اعلیٰ ثقافتی

کارناموں کے لیے مشہور ہے، رجب علی بیگ سرور کا یہ شعر لکھنؤ پر صادق آتا ہے:

سنار منواں بھی جس کا خوشہ چھیں ہے

وہ بے شک لکھنؤ کی سرزمین ہے

مرزا جعفر حسین لکھتے ہیں:

” لکھنؤ کی تہذیب اپنی جگہ پر ایک ایسی حسین و جمیل اور پُر کیف دنیا تھی جس کو شاہانِ اودھ کے دورِ اقتدار میں بسایا اور آباد کیا گیا تھا۔ ان حکمرانوں نے اس کی بنیاد کچھ ایسی ہنرمندی اور اتنے خلوص و انہماک سے رکھی تھی کہ انتزاعِ سلطنت کے تخمیناً آسی برس بعد تک اس کے آثار موجود تھے۔“ (۵)

رؤسا اور عمائدین کی وضع قطع الگ الگ تھی۔ کچھ لوگ سروں پر پٹے رکھتے۔ بعض خشنخی بال کٹواتے۔ لوگ ڈاڑھی مونڈتے تھے لیکن بڑی بڑی اور مشین مونچھیں رکھتے۔ بعض رئیس تو گل مچھے رکھواتے اور بڑی بڑی اور چوڑی چوڑی قمیصیں کترواتے۔ سرمہ لگانے کا عام رواج تھا اور عطر لگانا برکت کا باعث اور کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔ لباس میں عام طور پر سروں پر دوپٹی، کشتی نما، چوگوشیا یا قبہ دار ٹوپی رہا کرتی۔ بعد ازاں ترکی اور برابری ٹوپوں نے ان کی جگہ لے لی۔ ہندو امر اکو بانات کی گول ٹوپوں کی عادت تھی۔ جسم پر کرتا اور چیکن یا انگر کھا (دگلا) پہننا جاتا۔ بنیان کا وجود نہ ہونے کے باعث صدیاں پہنی جاتیں۔ موسم گرما میں چکن یا جامدانی کے انگر کھے اور موسم سرما میں جامد وار کی چکن یا چکن اور مہر مات کے انگر کھے شانِ امارت سمجھے جاتے تھے۔ شادی بیاہ یا دیگر خوشی کی تقریبات میں اطلس و زربفت استعمال کیا جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں چیکن کی جگہ اچکن نے لے لی۔ گلے میں ریشمی رومال پڑے رہتے۔

آرائش و زیبائش کے ضمن میں تمول اور رنگین مزاجی کے باعث جواہرات، شیشہ آلات اور رنگ برنگ پچی کاریوں کا شوق تھا۔ ریشموں کے ہاتھوں میں کم از کم پانچ ورنہ سات انگوٹھیاں پہنی جاتیں۔ بعض لوگ دو دو انگلیوں میں انگوٹھیاں پہنتے تھے۔ ان انگوٹھیوں میں فیروزہ، عقیق، یا قوت، زمرہ، زبرجد بہت پسند کیے جاتے تھے۔ انگوٹھیاں چاندی کی بنتی تھیں۔ نیلم کو مبارک یا منحوس سمجھ کر پس و پیش سے کام لیا جاتا۔ ہیرا عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ مرد سونا نہیں پہنتے۔

عورتوں کا لباس تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ ہندوستان کے ہر حصے میں قدیم زمانے سے ایک جیسا رائج تھا یعنی سر پر دوپٹہ، سینہ پر تنگ محرم اور پیٹھ پر ایک خاص قطع کی کرتی مگر لکھنؤ میں دوپٹہ، محرم اور کرتی۔ جو توں میں دلی کی سلیم شاہی وضع سے کچھ زیادہ فرق نہیں پیدا ہوا تھا البتہ سسکی، نرمی، آرائش و زیبائش وغیرہ۔ لکھنؤ کے معروف خورد و نوکے، جوتے، مٹھل، کنوواب، بانات، زربفت اور کینجٹ وغیرہ کا حسین و نازک کام کام ہوتا تھا۔ اودھ کی عورتوں کی شکل و صورت اور خد و خال کی دلکشی کا اعتراف مسز کڈرسل نے بھی اپنے خطوط میں کیا ہے۔ آنکھوں میں خطوط سرمہ کی گوشہ چشم کے باہر تک کشیدگی، ہونٹوں پر پان کا لاکھا، دانتوں میں مسی کا اوداپن، ہاتھ پیروں کی تھیلیوں اور ناخنوں میں سنہا کی سرنی اور اس میں نفاست کے ساتھ کچھ نقش و نگار، زیورات میں سر پر سنگار پٹی، مادھے پر بنا اور جھومر کانوں میں بالیاں، بجلیاں کان چین، بندے اور پتے، گلے میں تلسی، مالا، گلوبند، چمپا کلی، جگنا اور ہار، بازوؤں میں جوشن اور نوگے، ہاتھوں میں کرے چوڑیاں، جھانگیریاں، پونچیاں، کنگن اور علی بند، انگلیوں میں آرسی، چھلے اور انگشتریاں، بیروں میں بل، جھانوریاں، کرے، چاند توڑے، چھاگل، پازیب، کشتیاں اور رام جھول وغیرہ شامل ہیں۔ امیر عورتوں کے ان زیورات میں قیمتی موتی، زمرہ، ہیرے، نیلم اور پکھراج وغیرہ جڑاؤ کا کام ہوتا تھا جن کی وجہ سے ان کی تاب و تابش میں نمایاں اضافہ ہو جاتا تھا۔

محلات کی زندگی میں خانگی ماحول، انتظام خانہ داری، رہن سہن، بیگمات کا ذوق و شوق، ملازموں کا عملہ، زچہ خانہ اور تربیت و تعلیم اطفال کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ (۶) لکھنؤ کی اہم عمارتوں میں آصف الدولہ کا عالی شان محل ”دولت کدہ“، بیبا پور کا محل، چنٹ میں کوٹھی ”نرہت بخش“، بڑا امام باڑہ اور اس میں موجود آصف الدولہ کا مقبرہ، رومی دروازہ، چار باغ میں نوابان شیش محل کے مورث علی نواب حکیم مہدی کا محل، لامارٹیز کی عمارتوں میں مارٹن صاحب کی کوٹھی، لامارٹیز کالج، نواب سعادت علی خاں کی کوٹھیاں ”فرحت بخش“ اور ”حیات بخش“، انگریز ریزیڈنٹ کے قیام کے لیے ”ٹیڑھی کوٹھی“، دل آرام کوٹھی، دل کشا کوٹھی، کوٹھی نور بخش، خورشید منزل، غازی الدین حیدر کا تکمیل شدہ ”موتی محل“، شاہ نجف، نصیر الدین حیدر کی تعمیر ”کربلا ڈالی گنج پار“، محمد علی شاہ کا تعمیر کردہ امام باڑہ ”چھوٹا امام باڑہ“ اور واجد علی شاہ کی تعمیرات ”چھتر منزل“ اور ”قیصر باغ“ شامل ہیں۔

نواب آصف الدولہ کے بعد فنِ تعمیر کی تبدیلیوں اور انگریزی فنِ تعمیر کی تقلید کے حوالے سے یہ رائے ملاحظہ کیجیے:

”نواب آصف الدولہ کے بعد اودھ کے فنِ تعمیر کا مذاق بالکل بدل گیا تھا اور اب وہ زمانہ شروع ہو گیا تھا کہ جب یورپی اندازِ تعمیر کی تقلید میں عمارتیں بلحاظِ صلابت کمزور اور بلحاظِ ضرورت مفید تر بنائی جانے لگی تھیں۔ اس تبدیلی مذاق و انداز کا ذمہ دار اودھ میں دو عملی حکومت، سعادت علی خاں کی جزیر سی اور انگریزی اثرات کی افراط کو ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے

توناب نے جنرل مارٹین کی کوٹھی کو جسے اب چھتر منزل کہتے ہیں پچاس ہزار روپے میں خرید کر اس کا نام فرح بخش رکھا۔ پھر ٹیڑھی کو ٹھی شہزادہ سلیمان شکوہ سے لے لی اور دلآرام، دلکش، حیات بخش وغیرہ کوٹھیاں اور لال بادہ دری، خورشید منزل اور منور بخش وغیرہ عمارتیں خود تعمیر کرائیں۔ اس میں قدیم ہندوستانی وضع ترک کر کے یورپ کے انداز تعمیر کی تقلید کی گئی تھی۔ اس کوشش امتزاج رنگ میں نہ یہ عمارت ہندوستانی رہیں اور نہ خالص یورپی۔ بلکہ ان میں دونوں خصوصیات کا ایک ملا جلا انداز پیدا ہو گیا جو اپنی کمزوریوں کے باوجود حسن و زیبائش سے خالی نہیں ہے۔“ (۷)

شہر لکھنؤ کے باغات اور مرغزاروں میں چار باغ، نظر باغ، عیش باغ، عالم باغ، صفدر باغ، سندر باغ، ڈالی باغ، بندر یا باغ، بنارس باغ، بادشاہ باغ، بادشاہ باغ کی بارہ دری، کمپنی باغ اور دیگر کئی باغات اہمیت رکھتے ہیں۔

عمارات اور باغات کے ضمن میں مرزا جعفر حسین کی رائے ملاحظہ کیجیے:

”لکھنؤ کو باغوں اور مرغزاروں کا شہر کہا جاتا تھا۔ فرماؤ وایاں اودھ کو خوشنما باغات لگانے اور بلند وبالا، حسین و جمیل مستحکم و استوار عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔ آصف لدولہ نے لکھنؤ آتے ہی اپنے عالیشان محل موسومہ ”دولت خانہ“ میں اقامت فرمائی تھی۔ یہ محل مچھی بھون قلعہ کے نزدیک تیار کرایا گیا تھا۔ مچھی بھون کا قلعہ مسہار ہو گیا لیکن ”دولت خانہ“ درود یواری شکستہ کی شکل میں اب تک موجود ہے اور شیش محل کے نام سے موسوم ہے۔“ (۸)

محلوں میں شینجن محلا، پنج محلا، مبارک محلا اور دیگر برائے نام باقی ہیں۔ سڑکوں میں مال روڈ، وکٹوریہ سٹریٹ کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اہم گلیوں میں کٹرہ والی گلی، شاہ گنج کی گلی، ٹوریہ گنج کی گلی شامل ہیں۔ ڈالی گنج پار، سعادت گنج اور محلہ رکاب گنج کی منڈیاں تھوک فروشی کا مرکز ہیں۔ بازاروں میں عمید گاہوں میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے مواقع پر، عاشورہ محرم اور چہلم کے دن کربلائے تال کنورہ میں اور ہر میلے کے مخصوص مقامات جیسے بالے میاں کی یاد کنورہ سٹریٹ پر، ہولی کے دن گول دروازے کے مقابل وکٹوریہ پارک میں، نہان کے دن دریا کے قریب والی سڑک پر لگنے والے بازار خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ پرانے لکھنؤ کا قدیم چوک (لکھنوی تہذیب و ثقافت کا مرکز) بہت مشہور ہے۔ راج آلوقت سکوں میں پیسوں کے علاوہ دھیلے، دمڑیاں اور کوڑیاں شامل تھیں۔

اودھ کے باشندے اپنی عادات و اطوار کے حوالے سے نرم مزاج، پُر تامل اور مہمان نواز رہے ہیں اور مسز کنڈر سلی، جارج فورسٹر، ولیم ہوز وغیرہ نے ان کی ان خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ ہر رئیس کے ہاں ملازمین میں مولوی، اطبا، شعرا، خزانچی، محاسب، میر منشی اور پیش کار موجود رہتے تھے۔

معاشی فارغ البالی کی وجہ سے والیان ریاست میں جمال پرستی اودھ کے لیے اس طرح مخصوص ہو کر رہ گئی کہ زنان بازاری سے اختلاط عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ عورت ہر صاحب ثروت کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی۔ محفلوں سے نکالی گئی اور آبرو باختم طوائف مہمانوں کے استقبال اور بچوں کی تربیت کے لیے عام طور پر ملازمہ رکھی جاتی تھی۔ شجاع الدولہ سے واجد علی شاہ تک بہ استثنائے امجد علی شاہ کون شخص تھا جسے حسن پرستی کے جذبے سے بیگانہ سمجھا جائے۔ رؤسا اور عمائدین کے طرز زندگی سے ڈیرے دار طوائفیں بہت زیادہ متاثر تھیں۔ انتہائی صاف ستھرے کپڑے پہننا، پورے جسم کا بجز چہرے، گٹوں تک ہاتھ اور پیروں کا ڈھکار ہنا، شرافت و متانت سے گفتگو کرنا، تہذیب و اخلاق کا ہر موقع و محل پر لحاظ رکھنا، تمام رفتار گفتار میں شائستگی برقرار رکھنا ان کے لیے ضروری تھا۔ یہ تعلق جنسی لگاؤ سے بے نیاز تھا۔

سواری کے طور پر یکے، بند شکر م گاڑیاں شہر میں چلتی تھیں۔ رؤسا اور عمائدین عمدہ اور زرق برق چوپھلوں اور فینسوں پر سوار ہو کر نکلتے تھے، مستورات ڈولیوں، چوپھلوں اور فینسوں پر نکلتی تھیں جب کہ انگریز دور میں دو ایک گاڑیاں اور عوامی سطح پر یکے تھ اور تیل گاڑیاں بھی ذرائع نقل و حمل کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔

اودھ کی مصوری کے نمونے یا ان کی نقلیں لکھنؤ میوزیم، شاہ نجف، امیر الدولہ لاہیر پوری اور بعض تعلقہ داران اودھ کے مکانات میں دیکھ کر اس عہد کے موضوعات تصویر اور اسلوب قلمکاری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان تصاویر میں پس منظر کے طور پر آسمان پر رنگ برنگی بدلیاں دکھائی جاتی تھیں۔ عموماً کسی پرندے کی پرواز کا اہتمام بھی ہوتا تھا زمین پر ایک بڑبیوں دار دیوار پھولوں سے مزین رکھی جاتی تھی۔ تصاویر کے عام موضوعات بادشاہ اور امرائے دولت کی شہنشاہی، شاہی عمارت کے نقشے، جلسہ و جلوس

محلّات اور دربار کے مناظر، کسی امیر کے خانگی مشاغل، رقص و سرود کی محفلیں، ساون کی بہاریں، میدانِ جنگ کے سین، گھمسان کی لڑائیاں، سیر و شہار کی دلچسپیاں، جنگلات میں جانوروں کے جھرمٹ وغیرہ پر مشتمل ہوتے تھے۔ یہ تصویریں کاغذ اور کر مچ یعنی لائٹ ٹائٹ کے علاوہ شیشہ، ابرق، اخروٹ، ہاتھی دانت اور ظرف پر بھی بنائی جاتی تھیں۔ اودھ میں بھی بہت سے نامور خطاط پیدا ہوئے جو عموماً آغا عبدالرشید ویلیہی کے دبستان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں تین ماہر خطاط یعنی حافظ نور اللہ، قاضی نعمت اللہ اور عبداللہ بیگ آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ میں بھی آئے تھے۔ شجاع الدولہ کے دور میں جواہر علی خاں (خواجہ سرا) کے متوسلین میں محمد خلیل ایک کامل خوشنویس فیض آباد میں مقیم تھا۔

موسیقی کا شوق بھی شاہانِ اودھ میں شجاع الدولہ ہی کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ ہندوستان بھر سے عموماً اور تان سین کے دبستانِ موسیقی کے ماہر مطرب و رقص خاص طور پر فیض آباد میں جمع ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ اجودھیا، بنارس اور جون پور کے وہ فن کار بھی کلاسیکی رقص و موسیقی میں کمال رکھتے تھے۔ ان سب کے باہمی ربط و اتصال اور اشتراک سے اودھ میں موسیقی کی ایک نئی روایت قائم ہوئی تھی جس نے آصف الدولہ کے عہد میں زیادہ عروج حاصل کیا تھا۔ چنانچہ انہی نواب وزیر کی حوصلہ افزائی سے فن موسیقی کی لاجواب کتاب ”اصول النغمات الّاصفیہ“ وجود میں آئی۔ اس زمانہ میں نواب سالار جنگ علم موسیقی کے ماہر تھے۔ ان کے علاوہ بعض طوائف جیسے بڑی مصری، سُندر جان، نجبن، سلارو، کریم بخش، رادھا اور متھو وغیرہ شامل ہیں۔ سعادت علی خاں کے عہد میں پرکاش نامی ایک باکمال شخص اپنے فن والوں پر سبقت لے گیا تھا۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں لکھنؤ میں ایک زبردست موسیقی دان حیدری خان کے علاوہ رجب علی اور فضل علی دو درباری توڑ اور سہر و بانئی طوائف (جو کن سے آکر شاہی ملازمین میں شامل ہو گئی تھی) اس فن میں مہارت رکھتے تھے۔ چچو خان اور غلام رسول خان کے علاوہ دو اور توڑ بھی بہت مشہور ہوئے تھے۔ ”شوری“ کوٹھے کا موجود مانا گیا ہے۔ واجد علی شاہ کا درباری معنیٰ قطب علی خاں فن موسیقی اس قدر جانتا تھا کہ نانک بیجو، نانک گوپال اور تان سین وقت تھا۔ ان کے علاوہ ثابت علی اور چچو دو مشہور سازندے چھوٹے خان طبلہ باز اور غلام رضا، محمد حسن خاں، حیدر علی، ثار علی اور خواجہ بخش خان بھی ولی عہد کے ملازم تھے جن میں بیار خان، جعفر خان، حیدر خان، باسط خاں اور محمد علی خاں نے علم موسیقی پر تین کتابیں ”ناجو“، ”بنی“ اور ”ڈلہن“ تصنیف کی تھیں جن میں سے ”بنی“ زیادہ مشہور ہے۔

لکھنؤی دربار کے جملہ ذرائع تفریح میں درندوں، چوپایوں اور پرندوں کی معرکہ آرائیاں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ درندوں اور چوپایوں میں شیر، چیتے، تیندوے، گینڈے، ہاتھی، اونٹ، گھوڑے، مینڈھے اور بارہ سنگھے جیسے جانوروں کو لکھنؤ دربار میں ہم جنس اور غیر جنس دونوں سے لڑایا جاتا تھا۔ مولانا عبدالخلیم شرر لکھتے ہیں:

” لکھنؤ میں غازی الدین حیدر بادشاہ کو غالباً ان کے پور پین دوستوں نے درندوں کی لڑائی دیکھنے کا شوق دلایا، بادشاہ فوراً

آبادہ ہو گئے۔“ (۹)

جہاں تک پرندوں کی بات ہے تو اس سلسلے میں بھی لکھنؤ کا امتیاز اس کی انفرادیت مشہور عالم ہے۔ مرغ اور بئیر کی لڑائی تو مشہور تھی ہی لیکن تیتیر، لوے، گڈم، لال، کبوتر اور توتے جیسے معصوم پرندوں کی باضابطہ معرکہ آرائیاں چشم فلک نے لکھنؤ سے پہلے شاید کہیں اور کبھی نہیں دیکھی ہوں گی۔

درندوں اور چوپایوں کی لڑائیوں کا سلسلہ غازی الدین حیدر کے بعد تقریباً ناپید ہو گیا۔ شاید بعد کے شاہان یا تو اس طرح کے باذوق ثابت نہیں ہو پائے یا اس ذوق طرح کی نزاکتوں کے متمثل نہ ہو سکے۔

حوالہ و حواشی:

- ۱- عبدالباری، سید، لکھنؤ کے شعر و ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، مئی ۱۹۸۷ء، ص ۳۸
- ۲- محمد شفیع شیرازی، میرزا، معرکہ چکبست و شرر یعنی مباحثہ گلزارِ نسیم، مرتبہ: امیر حسن نورانی، لکھنؤ، نسیم بکڈپو، مارچ ۱۹۶۲ء، ص ۸
- ۳- شہناز بیگم، ڈاکٹر، اردو شاعری میں مغل سلطنت کے زوال کی عکاسی، نئی دہلی، انجمن ترقیِ اردو (ہند)، ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۹
- ۴- جعفر حسین، مرزا، لکھنؤ کا دسترخوان، لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکاڈمی، ۱۹۸۰ء، ص ۶-۲
- ۵- جعفر حسین، مرزا، قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۹۸ء، ص ۸

- ۶۔ مرزا جعفر حسین، قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۹۸ء، ص ۳۳
- ۷۔ صفدر حسین، ڈاکٹر سید، لکھنؤ کی تہذیبی میراث (تاریخ، تمدن اور تہذیب)، لکھنؤ، اردو پبلشر، ۱۹۷۸ء، ص ۳۳-۳۵
- ۸۔ شہناز بیگم، ڈاکٹر، اردو شاعری میں مغل سلطنت کے زوال کی عکاسی، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)، ۲۰۰۴ء، ص ۱۸۸
- ۹۔ لکھنوی، عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنؤ، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء، ص ۱۹۴